''شہرِ بے مثال'' میں لاہور کے شب و روز

The Days and Nights of Lahore in Shehr-e-Bemisal

ڈاکٹر عمارہ طارق

Abstract

Bano Qudsia was a novelist, fictionist, playwright, autobiographer, and spiritualist. She wrote Urdu literature distinctively in producing novels, drama plays and short stories. However, she succeeded in marking her eminent place as a novelist. She authored several memorable novels which remained in the living minds, and it includes 'Raja Gidh (The king Vulture)' which is well revered among readers of Urdu literature. This article is written on her novel 'Sheher e Bemasal' which is a book mark novel of the author; and it was actually written about 'the city of Lahore'. Banu Qudsia had clearly described the retrogression of civilization, ruination of values and custom, depravation, dorsoventrally contradiction, psychical intricacy and mental complexity of this city in said novel . This research article not only shower lights on all aforementioned components but effort has also been made for a critical review of said aspects.

Key Words: Bano Qudsia, Urdu Novel, Lahore, retrogression, intricacy

اصنافِ ادب میں ناول ایک اہم صنفِ ادب کا درجہ رکھتا ہے۔ ناول اپنے دامن میں انسانی معاشرے کی سرگرمیوں اور ان سے پیدا ہونے والے مختلف النوع کیفیات، ذہنی و قلبی میلانات و رجحانات، نفسیاتی الجھنوں اور باطنی کدورتوں، تاریخی عروج و زوال، انسانی خواب و خیال، واقعاتِ ہجر و وصال، تخیل کے معجزات و تجربات، اندرونی شکست و ریخت، نسلِ نو کے مسائل اور قلتِ وسائل غرض ہر موضوع کو سمیٹ سکتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ زندگی اور ناول کا فن ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہیں کہ ناول کو زندگی اور زندگی کو ناول کے آئینے میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ناول جسے ڈی ایچ لارنس نے گلیلیو کی دوربین سے زیادہ اہم ایجاد کیا ہے اور جس کی لامحدود وسعت کو ورجینا وولف نے یہ کہہ کر خراجِ تحسین بخشا ہے کہ اس میں سب کچھ سمویا جا سکتا ہے۔ اس کی حشر سامانیوں کا ادراک کرنا ضروری ہے یہ قدیم وجدید انسانوں اور تاریخ کا کباڑ خانہ نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں یہ مجذوب کی بڑ ہے کہیں مسرت و بصیرت کی آماجگاہ تو کہیں یہ بھول بھلیوں میں پھنسا دینے والی وادی ہے۔ کہیں یہ نارمل اور ابنارمل کرداروں کا

جنگل ہے تو کہیں یہ معاشرے کے ٹھکرائے لوگوں کا پاگل خانہ ہے۔ کہیں جامِ جم ہے تو کہیں جہاں نما۔ مجموعی طور پر یہ ایک نثری طلسم ہے جس میں شاعری کی دھڑکن بھی سنائی دیتی ہے۔(۱)

اُردو ناول کے اس نثری طلسم میں ہمیں کئی سحر پھونکنے والے ناول نگار دکھائی دیتے ہیں۔۔شعری دھڑکن کی صفت رکھنے والی اس صنف میں کئی ایسے مغنی اور شعر نواز ملتے ہیں جن کی لے پر قاری سر دھنتا اور وجد میں ڈوب جاتا ہے ایسے ناول نگار اردو ادب میں اگرچہ کم ہیں مگر یہ مختصر روایت تو انا ضرور ہے انہی ناول نگاروں میں بانو قدسیہ کا نام ایک مضبوط حوالہ ہے۔

بانو قدسیہ ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، سوانح نگار اور فلم نگار تھیں۔ افسانہ نگاری اور ڈرامہ نگاری میں بہت منفرد کام کیا تاہم ناول نگاری میں بھی اپنا سکہ جمانے میں کامیاب رہیں۔ انہوں نے اس روایت میں اہم یادگار ناول چھوڑے جن میں "راجہ گدھ" سے ادب کا ہر قاری واقف ہے۔ "راجہ گدھ" "ہو یا" حاصل گھاٹ"، "شہرِ بے مثال" "ہو یا" "شہرِ لازوال، آباد ویرانے" زندگی اور زندگی کی حقیقی تصویریں ہمیں ان ناولوں میں جیتی جاگتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ہنر اور فنی مہارت ہی ایک ناول نگار کو کامیاب بناتا ہے جب اس کی تحریر زندگی کا حقیقی رُخ ایسے پیش کرے کہ جہاں قاری کو وہ تحریر کوہ قاف کی حسیں وادیوں کی بجائے حقیقی دنیا کے میدان کارزار کی تلخ نوائی اور سنگلاخ حقائق سے روشناس کروائے۔ جہاں پیار و محبت کے حسین جھولوں کے ساتھ ساتھ ہجر و فراق کے کانٹے اور سسکتی بلکتی زندگی اپنے اصلی وجود کے ہمراہ موجود ہو۔ جہاں حسین نخلستانوں کی بجائے شہروں کی دھواں اُگلتی چمنیاں اور غلاظت میں اٹی بستیاں اور مسائل سے کلبلاتے ہوئے شہر بھی آنکھیں کھولے اپنے ہونے کا مکمل احساس دلاتے ہوں۔ یہ سب کچھ ہمیں بانو قدسیہ کے نالوں میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔

ڈاکٹر نورین رزاق بانو قدسیہ کی ناول نگاری کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''انسان کے جذباتی، نفسیاتی، روحانی اور باطنی مسائل ان کا خاص موضوع ہیں لیکن دیگر سماجی و معاشرتی تضادات بھی ان کے احاطۂ قلم میں آئے ہیں۔ وہ ایک طرف انسانی فطرت کی فریب کاریوں کا پردہ چاک کرتی ہیں تو دوسری طرف ان کے ہاں نفس کی کارفرمائیوں کے پیچھے پوشیدہ محرکات، داخلی و خارجی شخصیت کا تصادم اور روحانی کرب زیرِ بحث آیا ہے۔''(۲)

مصنفہ کا ناول راجہ گدھ حلال و حرام، عشق لاحاصل اور اس کے نتیجے میں سامنے آنے والے حقائق کو فلسفیانہ انداز میں بیان کرتا ہے تو "حاصل گھاٹ" کا موضوع مغرب کی اندھا دھند تقلید، اقدار کی شکست و ریخت اور عصرِ حاضر کے مسائل ہیں "شہرِ لازوال، آباد ویرانے" ان کا قیام پاکستان کے پسِ منظر میں ہجرت کے واقعات و سانحات اور کانگڑہ کے جغرافیائی خدوخال میں ابھرتی ہوئی کہانی اور اس کہانی میں خود ان کی ذات کی جھلک کے علاوہ عہدِ رفتہ کی صدائے بازگشت جیسے موضوعات پر مبنی ہے۔ ان کا ناول "شہرِ بے مثال" حقیقت میں ایک منفرد اور الگ

موضوع رکھتا ہے۔اس ناول میں مصنفہ کا اصل نشانہ "شہرِ لاہور" ہے۔ بانو قدسیہ نے واضح انداز میں اس شہر کے تہذیبی و تمدنی زوال، اقدار و روایات کی پامالی، اخلاقی گراوٹ، ظاہری و باطنی تفاوت اور ان مسائل کے شکار کرداروں کے نفسیاتی الجھاؤ اور ذہنی پیچیدگیوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ بانو قدسیہ کے اکثر افسانوں اور تحریروں میں ہمیں بڑے شہروں سے شکایت کا عنصر واضح دکھائی دیتا ہے مگر اس ناول کے آغاز سے اختتام تک یہ شکایتی انداز نوحہ بن کر گونجتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کچھ ناقدین کے خیال میں بانو قدسیہ کا یہ ناول "راجہ گدھ" اور "حاصل گھاٹ" کے مقابلے میں قدرے کمزور ہے مگر ہمیں یہ بات مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ اول تو مصنفہ کا یہ پہلا ناول تھا اور دوسرے "راجہ گدھ" اپنی Dimensions کے لحاظ سے کچھ مختلف اور الگ موضوعات کا حامل ناول ہے۔ جو فلسفہ اور نظریاتی حقائق راجہ گدھ کا موضوع تھے وہ عام زندگی سے قدرے الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ جبکہ "شہرِ بے مثال" صحیح معنوں میں ایک بڑے شہر کی چمکتی دھمکتی زندگی میں باطنی طور پر چھپی تاریکی اور اس میں لپٹے ہوئے تاریک لبادوں والے لوگوں کی کہانی ہے۔ یہ ناول حقیقی طور پر عصرِ حاضر میں "شہرِ لاہور" کا المیہ بلکہ نوحہ ہے اور یہی نقطہ اس ناول کو منفرد مقام بخش رہا ہے۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اردو ادب میں شہروں اور اس کے مسائل کے بیان کا موضوع نیا ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ موضوع احاطۂ قلم میں تو رہا مگر اس کا دائرہ کار محض کراچی جیسے بڑے شہر اس کے مسائل، بڑھتے جرائم، اخلاقی گراوٹ اور سسکتی زندگی تک گردش کرتا رہا۔ ایسے مصنفین میں شوکت صدیقی کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے کراچی شہر میں انڈر ورلڈ کے بڑھتے ہوئے جال، بچوں کی اغوا کاریوں، ہیروئن کی کھلے عام خرید و فروخت، جوان لڑکیوں کی بولیاں لگانا اور کوٹھوں کے کاروبار جیسے کریہہ جرائم کو اپنی تحریروں کے ذریعے بڑی جرات مندی سے بے نقاب کیا۔ انہیں اردو ادب کا پہلا "کرائم رائٹر" بھی کیا جاتا ہے۔ ناولوں میں جانگلوس، خدا کی بستی اور افسانوں میں کیمیا گر، اندھیرا اور اندھیرا، دوسرا آدمی اور دیگر مجموعوں میں ان موضوعات کو بکثرت دیکھ سکتے ہیں۔ مگر "لاہور شہر" کے بارے میں ہم عمومی طور پر مثبت نعرے سننے کے عادی ہیں مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا اس کے پیدا ہونے پر مہرِ تصدیق ثبت نہیں ہو سکتی اور "لہور لہور اے"، "زندہ دلان لاہور" اور لاہور والوں کی خوش خوراکی و مہمان نوازی وغیرہ وغیرہ۔ بانو قدسیہ نے ان اعترافات کے ساتھ ساتھ اس ناول کے ذریعے اس شہر میں بگڑتی ہوئی نسلِ نو، اُلجھتے ہوئے والدین، ڈگمگاتی ہوئی عمارتیں، ٹوٹتی ہوئی دہلیزیں اور کھوکھلی بنیادوں کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ دراصل بانو قدسیہ نے جس دور میں ادب میں قدم رکھا وہ سمجھ گئی تھیں کہ بجلی کے قمقموں میں روشنی تو موجود ہے مگر یہ تابنا کی ملمع شدہ ہوتی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان ان کیفیات کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بانو قدسیہ کے ناول اس دور میں سامنے آئے جب ہمارے معاشرے میں ذات کی شکست و ریخت، اخلاقی زوال اور بے سمتی کا نمایاں احساس پایا جاتا ہے۔ یہ احساس اس پُر آشوب دور میں اس بات کی علامت ہے کہ ہمیں اس امر کا ادراک ہو چکا ہے کہ ہماری اقدار

اندر سے اس قدر گل سڑ چکی ہیں کہ اگر صورتحال میں تبدیلی کا اہتمام نہ کیا گیا تو معاشرہ اپنی موت سے ہمکنار ہو جائے گا جس کا صریحاً مطلب یہ ہوگا یہ انسان زبردست ارتقاء کے باوجود اپنی ذات کے ہاتھوں شکست کھا چکا ہے۔(۳)

"شہرِ بے مثال" حقیقت میں "شہرِ لاہور" پر ایک طنز بھی ہے کہ یہ بے مثال شہر اپنے باطن میں منفی حقائق چھپائے ہوئے ہے۔ رشیدہ عرف رشو اس ناول کا بنیادی کردار ہے جو ایم۔اے سائیکالوجی کرنے بہاولپور سے لاہور آتی ہے۔ لاہور میں اس کا قیام رشتہ کی خالہ فیروزہ کے گھر ہے۔ خالہ فیروزہ امیر گھرانے کی خود پسند اور فیشن ایبل خاتون ہے۔ عیش و عشرت، بناؤ سنگار، اور جنسی لطیفے سنا کر مقبولیت حاصل کرنا اس کے محبوب مشاغل تھے۔ خاوند جمال محکمہ اینٹی کرپشن میں ملازم ہے مگر خالہ اس سے دلی نفرت کرتی اور اسے پیسہ کمانے کی مشین سمجھتی ہے۔ نہ صرف خالہ فیروزہ بلکہ اس کے بچے بھی اخلاقی بدحالی کا شکار ہو چکے ہیں اپنے گھر کی تباہی سے بے خبر خالو جمال دونوں ہاتھوں سے پیسے کمانے کے نشہ میں گم ہو چکے ہیں۔ بہاولپور کے سادہ ماحول کی عادی لڑکی کو یہ عجیب محسوس ہوتا ہے۔ کالج کا کھلا اور آزادانہ ماحول، لڑکے لڑکیوں کی بے تکلفی، اساتذہ کا ہر بات کو ضرورت سے زیادہ وضاحت و صراحت سے پیش کرنا اور لاہور کا گلیمر اپنے اندر بے تحاشہ سوالات سمیٹے بانو قدسیہ کے قلم سے پھسلتا چلا جاتا ہے۔ کلاس میں ظفر نامی ایک زمیندار لڑکے کا رشو جان کے عشق میں مبتلا ہونا، ظفر کے فیکٹریوں کے مالک والد ملک صاحب کی بھرپور جوان شخصیت، اَن پڑھ والدہ کا سادہ مزاج اور ملک صاحب کی اپنی بیوی کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار جہاں ناول میں کئی نفسیاتی الجھنوں اور خونی رشتوں میں فاصلوں اور پیچیدگیوں کو واضح کر رہا ہے وہاں اس تلخ حقیقت کو بھی فاش کر رہا ہے کہ والدین میں فاصلے اولاد کو بھی تباہ کر دیتے ہیں۔ رشو جان کا فیروزہ خالہ کے گھر کو چھوڑ کر اپنی مغرب پسند دوست ڈمپل کے گھر میں رہنا اسی کے انداز و اطوار میں رنگ جانا، ظفر کے لیے محبت کا جذبہ رکھنے کے باوجود دولت کی خاطر اس کے باپ سے شادی کر لینا اور پھر ضمیر کی ملامت، پشیمانی، کسک اور نفسیاتی توڑ پھوڑ سے تنگ آ کر جنونی کیفیت میں ملک صاحب کو قتل کر دینا یہ سب واقعات جس تسلسل سے ناول میں ظہور پذیر ہوتے ہیں بانو قدسیہ کی مہارت فن اور تمدن شہر لاہور کے بہترین عکاس ہیں۔

نیلم فرزانہ بانو قدسیہ کی ناول نگاری کے بنیادی موضوع کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

> ''پاکستان کی نوجواں نسل (جو 47ء کے بعد پیدا ہوئی) ذہنی و جذباتی پیچیدگیوں اور روحانی اضطراب کی کہانی ہے۔ 1947ء میں پاکستان کے قیام کے بعد جو معاشرہ پروان چڑھا اس کی بنیاد مادیت پر رکھی گئی۔ رفتہ رفتہ جاگیرداروں اور نوابوں کی جگہ سرمایہ دار طبقہ ابھرا۔ مادہ پرستی اور ظاہری آرائش و زیبائش کا زور بڑھتا گیا۔ نتیجے میں حساس ذہن رکھنے والے انسانوں کے اندر ایک روحانی اضطراب اور کشمکش کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس ناول میں جو کہانی پیش کی گئی ہے وہ پاکستان کی اسی موجودہ صورتحال کی عکاسی کر رہی ہے۔''(۴)

''شہرِ بے مثال'' میں ایسے ہی حساس ذہن رکھنے والے کئی کردار ابھرے جو مادیت پرستی، وجودی کرب، انتشارا

ورشکست وریخت کے تھپیڑوں کو برداشت نہ کر سکے اور اپنی جون تبدیل کر لی۔انتظار حسین کے افسانے" آخری آدمی" میں تاریخی واقعے کو واضح کرنے والی اس ساری بستی کے باشندوں کی جون تبدیل ہوگئی تو آج کے نفسانی دور میں" شہر لاہور" کے باسیوں کی جون تبدیل ہو جانا بعید از امکان نہیں ہے۔ناول کے آغاز میں بہاولپور سے لاہور آنے والی ٹرین میں سوار رشیدہ ایک معصوم اور سہمی ہوئی ایسی ہرنی دکھائی دیتی ہے جو ایک ہولناک جنگل میں داخل ہونے جا رہی ہو۔ جہاں ہر جانب درندے گھات لگائے بیٹھے ہیں۔یعنی رشو جان آغاز سفر میں ہی شہر لاہور کے بپھرتے دریا اور اس کی طغیانی کے سامنے اپنی بے پتوار و بے سہارا کشتی کو ڈوبتے دیکھ رہی تھی۔شہرِ لاہور کے تمدن اور اس کے باشندوں کے رویوں کی قلعی تب فاش ہوتی ہے جب رشیدہ خالہ فیروزہ کے گھر قیام پذیر ہوتی ہے۔لاہور کے رشتہ داروں کے بارے جو عکس بن چکا تھا وہ اب رشو کو عملی طور پر دکھائی دے رہا تھا۔

"جب سے رشو نے ہوش سنبھالا تھا لاہور والے رشتہ دار نہایت بے درد، بے حد پراسرار اور بہت ہی مختارِ کل تھے۔(۶)

دورانِ قیام فیروزہ خالہ کا رشو کے ساتھ سلوک "لاہوریوں" کی مہمان نوازی کا سارا بھرم توڑ دیتا ہے۔ گھر کے پچھواڑے میں گندہ سا کمرہ جس کی مخدوش حالت اور ناکارہ فرنیچر رشو کو اپنے غیر اہم ہونے کا مکمل ثبوت فراہم کر دیتے ہیں۔ بعد ازاں خالہ فیروزہ کی نازیبا حرکات،فحش زبان گوئی خاموش مدح سرائی کرنے والا شوہر اور تباہ ہوتی ہوئی اولاد تہذیبی زوال کو بھی عیاں کر دیتی ہے۔محض یہاں تک ہی کافی نہیں بلکہ گھر کے نوکر، رمضان اور انوری کی عشق ومحبت کی پینگیں،ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ،خاموش جملے اور اشارے بازی کو رشو اپنے کمرے کی کھڑکی سے نہ صرف دیکھتی بلکہ آہستہ آہستہ وہ اپنے اندر چھپے اس ناگ کو پھن پھیلانے سے روک نہ سکی جو لاہور، کی میٹھی بانسری کی دھن پر مکمل طور پر اپنی کینچلی سے باہر آ چکا تھا۔

''تھیوری اور تجربے میں جو فرق تھا وہی رشو جان کی تعلیم اور سادہ زندگی میں نمایاں تھا۔علم کے جو پشتارے رشو جان ذہن پر لادے پھرتی تھی بہاولپور میں نہ تو ان کے بطلان کی کوئی وجہ تھی اور نہ ان پر ایمان لانے کی کوئی دلیل۔لاہور کیا پہنچی کہ دل میں بغارے پڑ گئے۔طیغا توڑ کر جیسے کسی نے علم کی ساری کوٹھڑی ہی مسمار کر دی۔''(۷)

رشو جان لاہور شہر کی چکا چوند، متاثر کن مظاہر اور گلیمر سے متاثر ہو کر سب کچھ بھلا کر لاہور کے بے مثال رنگوں میں بہہ گئی۔

''لاہور میں بھالو کی سی خوبی تھی۔ساری دنیا جہاں منھ کے بل اپنے گن اور کرتب کا اظہار کرتی ہوں لاہور والے منھ میں کوکا کولا کی بوتل لیے سر کے بل اپنی برتری کا اظہار کرتے تھے۔رشو باجی نے بھی بھالو کو دیکھتے ہی زانوے تلمذ تہ کیا اور پچھلی پڑھائی جی سے بھلا کر از سرِ نو مکتب میں داخل ہوئی۔''(۸)

لاہور شہر کے باسیوں کے مغربی انداز کی اندھا دھند تقلید بانو قدسیہ کو ہمیشہ سے کانٹے کی طرح چبھتی تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ نسلِ نو کے اخلاقی زوال اور باطنی بھونچال کی ایک اہم وجہ مغربی روش کی سرپٹ دوڑ ہے۔ اس ناول میں ڈمپل کا کردار اس کا حلیہ، انداز واطوار اور چال ڈھال سب اسے مکمل طور ایک مغرب پرست لڑکی اور ایک امریکی اشتہار بنا رہے ہیں۔ ڈمپل اپنی خواہشات کے حصول کی خاطر اس قدر پستی میں گر جاتی ہے کہ مالک مکان سے ناجائز تعلقات قائم کرنے میں اسے قباحت محسوس نہیں ہوتی یہ وہ موڑ ہے جہاں بانو قدسیہ کا قلم زہر اُگلتا ہے۔ یعنی یہ کیسی مغرب پرستی اور زوال پذیر معاشرہ ہے جہاں ڈمپل جیسی لڑکی اپنی نمود ونمائش، عالیشان گھر، آرام دہ ماحول اور لاتعداد فضول خواہشات کی خاطر اپنی عزت کا سودا بخوشی کر لیتی ہے جبکہ اس کا باپ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہا ہے کیونکہ اس بڑھاپے میں اس کی ضروریات آسانی سے پوری ہو رہی تھیں۔

ڈمپل کے گلیمرس انداز اور طرزِ زندگی پر رشو جان فدا ہو جاتی ہے اور رہی سہی کسر تب پوری ہو جاتی ہے جب وہ خالہ کا گھر چھوڑ کر ڈمپل کے ہاں قیام پذیر ہوتی ہے۔ یوں بہاولپور کی سادہ لوح لڑکی کے اندر ایک نئی چمکتی دمکتی مغرب زدہ لڑکی جنم لے لیتی ہے۔ بازغہ قندیل بانو قدسیہ کے اس تحریری پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''بانو قدسیہ کے ناولوں کا اگر مطالعہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مصنف کے خیال میں ہمارا مذہب، معاشرہ، اقدار اور اخلاق اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مغربی روش کو اندھا دھند اپناتے چلے جائیں اور ان کے تتبع میں خدا اور روحانیت تو دور کی بات خود اپنی ذات تک کو کھو دیں۔''(۹)

شہرِ لاہور کے باسیوں میں ایک موذی سرطان جو تیزی سے پھیل رہا ہے بانو قدسیہ کے خیال میں وہ احساسِ برتری کا ناسور ہے اس شہر میں بسنے والے وہ چاہے فیروزہ خالہ کے روپ میں ہوں یا ظفر کے والد کی شکل میں، ڈمپل کی صورت میں جلوہ گر ہوں یا سائیکالوجی کے پروفیسر کی مانند غرور اور حد سے بڑھا ہوا احساس تفاخر ہمیں ان کرداروں کے لہجوں میں صاف سنائی دیتا ہے۔ بانو قدسیہ اس کی وضاحت یوں کرتی ہیں۔

> ''عام آبادی کی ایک شہ رگ ہوتی ہے۔ اس شہر کی شہ رگیں دو تھیں۔ ایک جو لہو کی گردش کے لیے مخصوص تھی اور ایک وہ جس میں احساس برتری کا ناگ پھن اٹھائے پھرتا تھا۔ یہ اس شہر کے لوگوں کو زیادہ عزیز تھی۔ شاید لہو کی گردش بند ہونے پر وہ زندہ رہ سکتے لیکن احساس برتری کے بغیر انہیں پل بھر بھی سانس لینا دشوار تھا۔''(۱۰)

یہ احساس برتری کا ناسور ہی تھا جو فیروزہ خالہ کے سارے گھرانے کو چاٹ گیا۔ یہی احساس تفاخر ملک صاحب کا اپنی اَن پڑھ سادہ لوح بیوی سے دور رہنے پر مجبور کرتا رہا۔ یوں اپنی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کے لیے بیٹے کی امانت میں خیانت رشو سے نکاح کی صورت میں کرتا ہے مگر اس کا انجام دردناک ہوتا ہے ملک صاحب اس حرکت سے نا صرف اپنے بیٹے کو ہمیشہ کے لیے کھو دیتے ہیں بلکہ چار دن کی چاندنی دیکھ کر رشو کے ہاتھوں جان کی بازی ہار

جاتے ہیں۔رشو کی ذات میں یہی احساس تفاخر ملک صاحب سے شادی کے بعد اس کریہہ شکل میں دکھائی دیتا ہے۔

''شادی کے بعد رشو کا آسائش کی گود میں پہنچ کر اس کا محبوب ترین مشغلہ ملک صاحب کو دبکا نارہ گیا تھا وہ ہنٹر بھر گھماتی اور شیر کرسی پر بیٹھ جاتا۔وہ چمڑے کا سانٹا سر پر گھماتی اور ہاتھی ناچنے لگتا۔۔۔وہ شوں شوں کرتی کتا دونوں ہاتھ اُٹھا کر ہڈی مانگنے لگتا۔''(۱۱)

آسائش کی گود جلد ہی انگاروں بھر جاتی جب رشو کو اپنے کیے پر پشیمانی ہوتی ہے۔حقیقت میں انسان کے اندر اظہار عمل اور انتخاب کی آزادی کی خواہش فطری ہوتی ہے مگر جب یہ خواہش اپنی حد سے تجاوز کر جائے اور زمانے، ماحول اور معاشرے سے متصادم ہو جائے تو وجود کی شکست و ریخت سامنے آتی ہے۔خوف، وہشت اور تنہائی سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ کیفیات روحانی اضطراب اور کرب و ملال پیدا کر دیتی ہے تب انسان موت کی تمنا کرتا۔دیوانگی وخودکشی کا مرتکب ہوتا یا عالم جنوں میں دوسروں کو مارنے کے درپے ہو جاتا ہے۔رشو جان کے ہاتھوں ملک صاحب کا قتل دراصل انہی نفسیاتی مسائل کی عکاسی کر رہا ہے۔

اس ناول میں لاہور شہر کے دامن میں پنپنے والی طوائفوں کی دنیا کا عکس گلناز کے کردار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔گلناز ایک طوائف ہے جو غازی سے محبت کرتی ہے مگر غازی روایتی انداز میں باپ کی ناراضگی کے خوف سے اس سے شادی نہیں کر سکتا۔گلناز اسی کو بہتر سمجھتی ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتی کہ شادی کے بعد غازی اسے چھوڑ دے اور محبت کا یہ آبگینہ بھی ٹوٹ جائے کیونکہ اس محبت کے علاوہ اور کچھ بھی اس کی زندگی میں مکمل اور جڑا ہوا نہیں ہے اور یہی ہر طوائف کا مقدر ہے۔

''اگر۔۔۔اگر۔۔۔شادی کے بعد تم نے مجھے چھوڑ دیا تو۔۔۔تو غازی۔۔۔کچھ ایسا تو میرے پاس رہنے دو جو ٹوٹا ہوا نہ ہو''(۱۲)

اس ناول کا ایک مختلف اور دلچسپ پہلو یہ کہ بانو قدسیہ نے لاہور شہر کی ثقافت، تہذیب و تمدن، اخلاقیات، روایات، تعلیمی نظام اور معاشرتی حقائق کو کرداروں کی صورت میں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف اساطیری حوالوں، حکایتوں اور دانش وحکمت کی کہانیوں کو اپنی دلیلوں کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔ یہ انداز مصنفہ کے ناول کو فنی طور پر مضبوط کرتا ہے۔

سید جاوید اختر لکھتے ہیں۔

''شہر بے مثال میں مصنفہ نے اپنے دور کے ناولوں سے ہٹ کر ایک نیا تجربہ یہ کیا ہے کہ قصہ کے بیچ بیچ متعدد حکایتیں بیان کی ہیں۔اساطیری طرز کی یہ حکایتیں بیشتر مقامات پر واقعی داستان کو دوبالا کرتی دکھائی دیتی ہیں''(۱۳)

اس کے علاوہ " شہر لاہور" کے بازاروں، سڑکوں اور دیواروں پر چسپاں اشتہارات کی جزئیات بھی مصنفہ نے انتہائی باریک بینی سے پیش کی ہیں جس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ناول لاہور کے ایک ایک پہلو کو بیان کر رہا

ہے۔

"فلمی سائن بورڈ پر بنائی ہوئی تصویریں ایک سی تھیں ایکٹرسوں کے بھرے بھرے سرخ ہونٹ، گالوں تک آیا ہوا ایک آنسو، قوالی کے انداز میں اٹھے ہوئے ہاتھ، ٹھہرو۔۔۔ جاؤ پکارتا ہوا ہیرو، جھروکے سے جھانکتی ہوئی آنکھیں،۔۔۔ ولین جی کی آنکھ پر چمڑے کی اندھیاری تھی۔۔۔۔ یہ سارے سائن بورڈ رنگ ونور کا گلال بکھیرے اسے بلا رہے تھے۔ سارے لاہور کا گلیمر اس کے استقبال کے لیے بڑھا آ رہا تھا۔(۱۴)

زندہ دلانِ لاہور کے کھانوں اور خوش خوراکی سے سارا ملک واقف ہے بانو قدسیہ نے بھی مختلف کھانوں اور پکوانوں کی منظر کشی دلچسپ انداز میں کی ہے۔

"ہریسہ، شب دیگ، نہاری یہ کھانے کی کونسی قسمیں تھیں، ان کا نام نہایت روح افزا تھا۔ ان کے نام سن کر رشو کو احساس ہوتا تھا کہ جیسے کسی مغلیہ سلطنت کے شاہی دسترخوان پر ٹخنے ٹخنے تک کام لیٹ کی پشوازیں پہنے کنیزیں نعمتیں چن رہی ہوں۔ چاندی اور سونے کے ظرف کندھوں پر ٹکائے آبدار خانے سے ٹھنڈی صراحیں لاتی ہوئی سیاہ حبشنیں۔۔۔ فضا میں ہرن کے گوشت کی مہک الائچی پان کے پتے اور کیوڑے کی خوشبو۔۔ یہ سارا تصور صندل کے جنگل کی طرح مہکا ہوا تھا۔(۱۵)

مذکورہ بالا تحقیق و تجزیہ کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ بانو قدسیہ کا یہ ناول اس لحاظ سے باقی ناولوں سے منفرد ہے کہ اس میں "شہر لاہور" کے دامن میں پیدا ہونے اور تیزی سے بڑھتے ہوئے مسائل کو بے نقاب کیا گیا ہے پطرس بخاری نے کہا تھا کہ توسیع شہر ایک عارضہ ہوتا ہے جو کسی شہر کو لاحق ہو کر اسے بدصورت کر دیتا ہے اور یہ عارضہ لاہور شہر کو لاحق ہو گیا ہے۔ بانو قدسیہ نے اس عارضے کے ساتھ شہر لاہور کو لاحق ان جملہ امراض کی نشاندہی بھی کی ہے جو اس شہر کی صورت و ہیئت کو تباہ کر رہے ہیں۔ ان عوارض کی نشاندہی کرتے ہوئے بانو قدسیہ کے اندرونی کرب، اضطراب اور بے چینی پورے ناول میں واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے جو وہ اس شہر کو بگڑتے دیکھ کر محسوس کرتی ہیں۔ داستان سرائے میں رہنے والوں کو اس پُرسکون شہر کا فسوں ہی اچھا لگتا تھا مگر یہ فسوں جنوں میں بدلتے دیکھ کر مصنفہ یہ ناول لکھنے پر گویا مجبور ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

"ایک حقیقی فنکار کرب سے گزرے بغیر اچھا ناول تخلیق نہیں کر سکتا۔ ناول اس کے تجربے مشاہدے اور نظر کی گہرائی کا نچوڑ ہوتا ہے جس کرب سے وہ خود گزرتا ہے اسی سے قاری کو بھی گزارتا ہے۔ یعنی یہ مرحلہ۔۔۔ نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر" والا ہوتا ہے۔(۱۶)

یہ ناول بھی بانو قدسیہ کے خونِ جگر کی داستاں ہے جو شہرِ بے مثال کے بدلتے رنگوں اور بگڑتی صورتوں پر قطرہ قطرہ لفظوں کی صورت میں ٹپکتی چلی گئی ہے۔

حواشی:

۱۔ ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،اُردو ناول کے چند اہم زاویے (کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،2003)،ص23۔

۲۔ نورین رزاق،ڈاکٹر، پاکستانی خواتین افسانہ نگار(لاہور:دستاویز مطبوعات،2016ء)،ص31۔

۳۔ ممتاز احمد خاں،ڈاکٹر،اُردو ناول کے بدلتے تناظر(کراچی:اُردو اکیڈمی پاکستان،2007ء)،ص194۔

۴۔ نیلم فرزانہ،اُردو ادب کی خواتین ناول نگار(لاہور:فکشن ہاؤس،س ن)

۵۔ بانو قدسیہ،شہرِ بے مثال (لاہور:الحمد پبلیکیشنز،1967ء)،ص7۔

۶۔ ایضاً،ص12۔ ۷۔ ایضاً،ص20۔ ۸۔ ایضاً،ص25۔

۹۔ بازغہ قندیل،اُردو ناول میں زوالِ فطرتِ انسانی کی تمثیلات(اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان، 2012ء)،ص112۔

۱۰۔ بانو قدسیہ،شہرِ بے مثال،ص23۔

۱۱۔ ایضاً،ص147۔ ۱۲۔ ایضاً،ص116۔

۱۳۔ جاوید اختر،ڈاکٹر، اُردو ناول نگار خواتین: ترقی پسند تحریک سے دورِ حاضر تک (لاہور:سنگ میل پبلیکیشنز،1979ء)،ص64

۱۴۔ بانو قدسیہ،شہرِ بے مثال،ص15 ۱۵۔ ایضاً،ص36

۱۶۔ ممتاز احمد خان،ڈاکٹر، آزادی کے بعد اُردو ناول (کراچی:انجمن ترقی اُردو،1997ء)،ص31۔

مآخذ:

بازغہ قندیل۔اُردو ناول میں زوالِ فطرتِ انسانی کی تمثیلات۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان، 2012ء۔

بانو قدسیہ،شہرِ بے مثال ۔لاہور:الحمد پبلیکیشنز،1967ء۔

جاوید اختر،ڈاکٹر۔ اُردو ناول نگار خواتین: ترقی پسند تحریک سے دورِ حاضر تک ۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز۔

ممتاز احمد خان،ڈاکٹر، آزادی کے بعد اُردو ناول ۔کراچی:انجمن ترقی اُردو،1997ء۔

ممتاز احمد خان،ڈاکٹر۔اُردو ناول کے چند اہم زاویے ۔کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،2003۔

ممتاز احمد خاں،ڈاکٹر۔اُردو ناول کے بدلتے تناظر۔کراچی:اُردو اکیڈمی پاکستان،2007ء۔

نورین رزاق،ڈاکٹر۔ پاکستانی خواتین افسانہ نگار۔لاہور:دستاویز مطبوعات،2016ء۔

نیلم فرزانہ۔اُردو ادب کی خواتین ناول نگار۔لاہور:فکشن ہاؤس،س ن۔